Scanned by CamScanner

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

Scanned by CamScanner

سہ ماہی

اذکار

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

مدیران

عزیز اللہ بیگ　　اکرم نقاش

کرناٹک اُردو اکادمی بنگلور

Scanned by CamScanner

AZKAAR

QUARTERLY URDU LITERARY JOURNAL

ISSUE: 28 O 2015

Chief Editor: **Dr. Fouzia Choudhry**
Editors: **Azeezulla Baig, Akram Naqqash**
Publisher: **Registrar, Karnatka Urdu Academy**
Kannada Bhavan, J.C. Road, Bangalore-560002
karnatakaurduacademy@gmail.com

Price: Rs. 100/-

اذکار

شمارہ (28)

کمپوزنگ : حسن محمود

سرنامے کی خطاطی : اکرم نقاش

سرورق : سید مشتاق فاروق

طباعت : نیشنل پرنٹرس بنگلور ۵۳

ناشر: کرناٹک اُردو اکادمی بنگلور

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

کرناٹک اُردو اکادمی، کنڑا بھون، جے سی روڈ، بنگلور۔560002

فون/فیکس: 080-22213167

Email:
karnatakaurduacademy@gmail.com
drfouziachoudhary@gmail.com
azeezullabaig@gmail.com
akramnaqqash61@yahoo.com
akramnaqqash74@gmail.com

اذکار کی مشمولات کی آرا سے کرناٹک اُردو اکادمی کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔

Scanned by CamScanner

مشمولات

مضامین

افسانے

گفتگو

خاکہ

Scanned by CamScanner

انتظار حسین : ''اپنی دانست میں''

(پروفیسر شمیم حنفی کے نام)

سرورالہدیٰ

انتظار حسین نے 'اپنی دانست میں' کی تحریروں کو ادبی معاملات میں شرکت اور کچھ اپنی زبان میں اظہار خیال کا نام دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلی ہی منزل میں خود کو نقاد کے بنیادی منصب سے الگ کیوں کر بتاتے ہیں۔ اس کا ایک سیدھا سا جواب یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر فکشن رائٹر ہیں اور تنقید نگاری ان کا میدان نہیں۔ تو پھر اتنی بڑی تعداد میں ان تحریروں کا کتابی شکل میں شائع ہونا کس بات کا اشارہ ہے۔ تخلیق کاروں کے لیے یہ آسانی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی اور فیصلہ کن بات کہہ دیتے ہیں اور ان کی گرفت نہیں ہوتی یا اسے ایک نئے ذائقے کے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے۔ انتظار حسین کو بھی یہ آسانی حاصل رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انتظار حسین کی ان تحریروں سے ادبی معاملات میں ان کی گہری شرکت کا اظہار ہوتا ہے۔ انھیں کسی بھی طرح سے ادبی تنقید کے بنیادی تقاضوں سے بے نیاز نہیں بتایا جا سکتا اور نہ ہی تخلیقی معصومیت کے نام پر ان کے مضامین کو معصوم ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ کہیں کہیں اس چالاکی کا احساس بھی ہوتا ہے جس کی مثالیں باضابطہ ناقدین کے یہاں مل جاتی ہیں۔ پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''ارے یہ تو بوند بوند کر کے پھر تالاب بھر گیا۔ بھلا ہم کہاں کے نقاد اور کون سے عالم فاضل ہیں کہ مقالے لکھنے کی نیت سے قلم اٹھاتے۔ بس یہی ہوتا رہا کہ جب کوئی ادبی بحث گرم ہوئی تو ہم نے اپنی طرف سے ٹکڑا لگا دیا۔ دیکھیے جب بحث گرم ہو اور اردگرد سب اپنی منطق بگھار رہے ہوں تو آخر

Scanned by CamScanner

بندہ بشر ہے۔ اس کے اندر بھی کھد بد ہونے لگتی ہے اور کھد بد کرتی ہنڈیا
کسی وقت تو ابلے گی اور قلم چلے گا۔ بات بے شک ادھوری رہ جائے مگر
بساط بھر کچھ کہا جائے گا۔''

''ہم نے اپنی طرف سے ٹکڑا لگا دیا'' کوئی رواروی میں کیا گیا فیصلہ نہیں ہے۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ ادبی معاملات میں یہ دلچسپی ایک باشعور شخص کا فیصلہ ہے۔

'اپنی دانست میں' کے ابتدائی تین مضامین عصر حاضر میں ادب کی صورتِ حال سے متعلق ہیں (1) اکیسویں صدی میں ہمارا ادب (2) آج کے آشوب میں ہمارا ادب (3) ادب، قومی شناخت اور کالا باغ ڈیم۔ یہ تینوں عنوانات عمومی نوعیت کے ہیں مگران کے تحت جو باتیں زیرِ بحث آئی ہیں ان میں ایک گہری سوچ موجود ہے۔ یہ سوچ ایک تخلیق کار کی ہے جو ادبی صورت حال کو کسی اور انداز سے دیکھتا ہے۔ اس کی مشکل یہ ہے کہ وہ کس طرح کے ادب کو ادب کہے۔ عصری ادب کا وہ کون سا ایسا حصہ ہے جس پر صحافیانہ ہونے کا الزام لوگ اس لیے لگاتے ہیں، تا کہ زندہ حقائق سے چشم پوشی کی جا سکے۔

''بیسویں صدی میں ہمارا ادب'' میں مجموعی اعتبار سے نسائی ادب کا حوالہ زیادہ آیا ہے۔ انتظار حسین کو پاکستان کی موجودہ صورت حال میں ماضی کی وہ تحریکیں یاد آتی ہیں جن سے وابستہ افراد نے انفرادی اور اجتماعی طور پر ایک آئیڈیل ریاست کا خواب دیکھا تھا ۔انتظار حسین نے بیسویں صدی کو خوابوں کی صدی کہا ہے، لیکن انسانی زندگی کن تباہ کاریوں سے دوچار ہوئی اسے خوابوں کی کیا قیمت چکانی پڑی۔ پھر برصغیر کے مسلمانوں نے کیا خواب دیکھے۔ عالمی سطح پر جو کچھ ہو رہا تھا اس کا اثر برصغیر کے مسلمانوں پر ہونا فطری تھا۔

Scanned by CamScanner

سوویت روس کے سپر پاور بننے اور عرب اسرائیل جنگ جیسے واقعات کی روشنی میں انتظار حسین نے بیسویں صدی کی ایک تصویر بنائی ہے۔ بیسویں صدی کا ایک اہم خواب پاکستان کا قیام بھی تھا۔ انتظار حسین نے اس تعلق سے لکھا ہے:

> ''مگر اس دوران ہندی مسلمانوں نے پھر ایک خواب دیکھ لیا تھا۔ خیر اس مرتبہ وہ بہت اونچے نہیں اڑے۔ برصغیر ہی کی حدود میں ایک مملکت کے قیام کا خواب تھا، جلد جلد اس کی پرورش کی۔ اور عجب ہوا کہ جلد ہی اس خواب کی تعبیر بھی نکل آئی اور بیسویں صدی میں رونما ہونے والا یہ واحد خواب تھا جس نے صدی کی حد کو پھلانگ کر اکیسویں صدی میں قدم رکھا اور اے لو صدی ختم ہوتے ہوتے جمال الدین افغانی کا پہلا خواب بھی پھر سے منور ہو گیا مگر کس رنگ سے۔ اب یہ خواب جمال الدین افغانی سے چل کر اسامہ بن لادن تک پہنچ چکا تھا۔ تب کیا رنگ تھا اب اس نے کیا گل کھلائے۔'' (ص10)

یہ اقتباس سیاسی نوعیت کا ہے اور جو لوگ انتظار حسین کے سیاسی موقف کو ان کے فکشن میں تلاش نہیں کر سکے انھیں اس قسم کی تحریروں کو پڑھنا چاہیے۔ جمال الدین افغانی کے خواب کی تعبیر کی صورت کا نکل آنا حوصلہ افزا تو ہے مگر اس کے بعد جو صورتیں سامنے آئیں ان کا تعلق جمال الدین افغانی کے خواب سے کتنا ہے۔ انتظار حسین نے تقسیم اور اس کے بعد کی صورت حال کو اشاروں میں بند کر دیا ہے۔ ایسے میں اقبال کا یاد آنا بھی فطری تھا۔ آج بھی اقبال کو برصغیر کی اس نئی مملکت کے قیام کا نظریہ ساز بتایا جاتا تھا۔ انتظار حسین اس سیاق میں اقبال کے دو شعر پیش کرتے ہیں:

Scanned by CamScanner

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابِ خاکِ کاشغر

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

انتظار حسین کو جمال الدین افغانی اور ان کے خواب کی تعبیر سے کوئی اختلاف نہیں۔ مگر اس خواب کی تعبیر کو جو معنی پہنائے گئے اس پر نہ خواب کا کوئی اختیار تھا نہ خواب دیکھنے والے کا۔ معنی کا یہ عمل شعر و ادب میں بھی اپنا جلوہ دکھا رہا تھا اور عام زندگی میں بھی۔ انتظار حسین نے اس موقع پر ایک ایسی کشادہ ذہنی کا ثبوت پیش کیا ہے جو مطالعۂ اقبال میں کافی دیر سے باریاب ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک مخصوص فکر ایک بڑی شاعری میں تبدیل ہو کر کائنات کو اپنے گھیرے میں لے رہی ہے۔ چنانچہ انتظار حسین کو اس بات کا دکھ ہے کہ خواب کی تعبیر کا حشر کیا ہوا اور کیسے کیسے گل کھلائے گئے۔ انہیں اقبال کی شاعری میں اپنے ادبی ذوق اور تصور کائنات کی تسکین کا سامان مل جاتا ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں:

''مگر اس خواب نے اس مقام سے بڑھ کر اقبال کی شاعری کو خلاق تخیل کی بلندیوں پر بھی پہنچایا بلکہ شاید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس خواب کے طفیل ہمیں اپنی شاعری میں ایسا شاہ کار میسر آیا ہے جسے ہم بیسویں صدی کی سب سے شان دار اردو نظم قرار دے سکتے ہیں۔ میری مراد 'مسجد قرطبہ' ہے۔

اقبال نے آبِ رودِ گنگا سے آغاز کیا تھا:

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

Scanned by CamScanner

اب وہ تخیل اس مقام سے گزر کر ایک اور خواب دیکھ رہا تھا:

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

(ص11-12)

اقبال کی جس فکر کے آغاز اور اس کی انتہا کا حوالہ آیا ہے اگر کوئی سکہ بند نقاد ہوتا تو اس مرحلے سے خود کو اور قاری کو آسانی سے گزرنے نہ دیتا۔ مسجد قرطبہ میں تخیل کی وہ سطح ہے جو موضوع کو آفاق کی وسعت عطا کر دیتی ہے۔ انتظار حسین اتنی بڑی نظم کی تخلیق کا محرک اس خواب کو بتاتے ہیں جسے جلال الدین افغانی نے دیکھا تھا اور جو مختلف حوالوں سے اقبال تک پہنچا۔ کوئی نام نہاد ترقی پسند نقاد ہوتا تو اقبال کے خواب کی گرفت کرتا اور مسجد قرطبہ میں کوئی نہ کوئی ایسی بات دریافت کر لیتا جس سے اس کی ترقی پسندی پر حرف آتا ہو۔ اسی لیے ایک تخلیق کار کا ادبی مطالعہ دوسروں سے زیادہ ذمہ دارانہ معلوم ہوتا ہے۔

انتظار حسین کو دکھ کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے:

''جمال الدین افغانی کی فکر میں پلا خواب اقبال کی شاعری میں جگمگاتا خواب اب بم دھماکوں میں لپٹ کر ہمارے روبہ رو ہے۔'' (ص11)

اس کے بعد وہ زہرا نگاہ کی نظم سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ مضمون پاکستان کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورتِ حال کے سیاق میں لکھا گیا ہے، لہٰذا حوالے بھی پاکستانی ادب سے آئے ہیں۔ یہ حسین اور جگمگاتا خواب دیگر مقامات پر بھی دھماکوں میں لپٹا ہوا ہے۔ انتظار حسین ایک حساس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے اچانک ادب کی طرف آ جاتے ہیں۔ مسئلہ

Scanned by CamScanner

چونکہ اکیسویں صدی میں ادب کا ہے اس لیے وہ بیسویں صدی سے اس کا ایک تاریخی اور داخلی رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ انتظار حسین ان حضرات کی اس فکرمندی کا جواب دیتے ہیں کہ ادب میں بالکل سناٹا ہے۔ انتظار حسین اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے ایک اور دکھ میں ہمیں شامل کرتے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم پر اب کسی طرح کی تحریر کا اثر نہیں ہوتا۔ ہم صورت حال کی حساسیت اور سنگینی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ تحریکات کے زیر اثر لکھی جانے والی شاعری کو ایک اساس مل جاتی ہے لیکن جب آزادانہ طور پر کوئی چیز پیش کی جارہی ہو تو اس کے بارے میں ہماری رائے تاخیر سے بنتی ہے۔ انتظار حسین تحریکات کے تاریخی کردار کے منکر نہیں مگر تحریکات کی روشنی میں عصری ادب کو دیکھنا ہمیں غلط نتیجے تک پہنچا سکتا ہے۔ انتظار حسین شاعرات کی شاعری کو عصر حاضر کا ایک اہم واقعہ بتاتے ہیں:

> ''یہ جو لکھنے والیاں بہت باغیانہ موڈ میں نظر آرہی ہیں ہاتھوں میں تانیثیت کا علم ہے اور بغل میں نسوانی رنگ میں ان کی باغیانہ نظمیں ہیں، یہ سب کچھ کیا ہے۔ پھر اس عمل کو اس تحریک کے سیاق وسباق میں بھی دیکھیے جو ملک میں عورتوں کے حق میں چل رہی ہیں۔ تحریکوں کے سینگ تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ بس ایسے ہی نشانات سے پہچانی جاتی ہیں۔'' (ص 15)

مضمون کے اختتام پر بھی انھوں نے عورتوں کی شاعری کو اپنے عہد کی بنیادی حسیت سے قریب بتایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہر طرح کی بپتا عورتوں ہی پر پڑتی ہے۔ ایسے میں ان کے مسائل اور موضوعات مختلف بھی ہیں اور وافر بھی ہے۔ عورتوں پر زیادتیوں کی ایک لمبی فہرست ہے اور اس فہرست کو سامنے رکھ کر کوئی اچھی شاعری نہیں کی

Scanned by CamScanner

جا سکتی مگر مسائل تخلیقی عمل کو متاثر ضرور کرتے ہیں۔ انتظار حسین نے مرد لکھنے والوں کی باخبری کی تعریف کی ہے لیکن ان کی اس بات پر واقعی غور کرنے کی ضرورت ہے:

"مرد لکھنے والوں کا معاملہ یہ ہے کہ عصری شعور برحق۔ جو کچھ ہمارے اردگرد ہو رہا ہے۔ بیدار ذہن رکھنے والے کے یہاں اس کے خلاف ردعمل کسی نہ کسی رنگ میں آنا چاہیے مگر شاید کوئی ایک مسئلہ تخصیص کے ساتھ اسے پریشان نہیں کر رہا ہے بلکہ دہشت گردوں کے خلاف بھی ردعمل زیادہ شدت کے ساتھ مجھے نسوانی شاعری ہی میں نظر آتا ہے۔" (ص 18)

مختلف مسائل میں بٹا ہوا ذہن بعض اوقات منتشر ہو جاتا ہے ایک بڑا تخلیقی ذہن ہی مسائل کا بوجھ اٹھا کر ان میں وحدت قائم کر سکتا ہے۔ انتظار حسین دہشت اور خوف کے عالم میں بسر ہونے والی زندگی کو دیگر مسائل کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں، انتظار حسین جیسا تخلیق کار جس نے عصری مسائل کے نام پر کوئی صحافیانہ تحریر پیش نہیں کی۔ انھوں نے جن نظموں کی تعریف کی ہے ان میں ایک سپاٹ بیانیہ ہے۔ یہ شاعری تلخ ترین حقائق کو مابعدالطبیعیات کی حد میں داخل ہونا نہیں چاہتی۔ انتظار حسین ادب پر میڈیا کے اثرات کی جانب اشارا کرتے ہیں۔ انتظار حسین عصر حاضر کے ادب کو میڈیا گزیدہ بتاتے ہیں بلکہ وہ اس حد تک لکھتے ہیں کہ کیا اب کوئی ایسا پیمانہ وضع کیا جائے گا جو اس میڈیا گزیدہ ادب کو ادب ثابت کر سکے۔ انھوں نے مقبول عام ادب کا فقرہ استعمال کیا ہوتا تو ادب کے سماجیاتی مطالعے کی ایک جہت سامنے آجاتی اور اس طرح میڈیا گزیدہ ادب کے جواز کی صورت نکل آتی۔ انتظار حسین کا خیال ہے کہ ادب کے اس صحافیانہ مزاج کے فروغ میں ناول نے اہم

Scanned by CamScanner

کردار ادا کیا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں جتنے ناول نگار اردو میں پیدا ہوئے اس کی مثال دوسری زبانوں میں نہیں ملے گی۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

''سو اب ہم اکثر وبیش تر ادب کو بھی صحافت کے ہی پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایسے ناول بہت اپیل کرتے ہیں جہاں مسائل، معاملات کا اظہار سیدھا صحافیانہ رنگ میں ہوتا ہے۔'' (ص 18)۔

کوئی معاشرہ جب اپنی تہذیبی اور ادبی روایت سے بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے اسے وقتی شہرت اور مالی منفعت کی تلاش کا نام دینا غلط ہوگا۔ پاکستان میں جونسل انگریزی میں ناول لکھ کر اپنے ہی لسانی معاشرے میں خود کو مختلف ثابت کرنا چاہتی ہے اسے 'تھوڑی سی فضا اور سہی' کی طرح دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر یہاں سے وہاں کی اصل صورت حال کا اندازہ نہیں کرسکتا، یہاں بھی بعض لکھنے والے انگریزی کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ وہ انگریزی میں لکھ کر اپنی محدود و بصیرت کے ساتھ اپنے لسانی معاشرے کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں ،انتظار حسین نے ایک دکھتی رگ پر انگلی تو رکھ ہی دی ہے اور اس کی بنیاد چوں کہ تہذیبی ہے لہٰذا اس پر 'یاران نکتہ داں' کا تلملانا فطری ہے۔ مجموعی طور پر نوآبادیاتی ذہن سے ہمارے لکھنے والے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ تیسری دنیا انگریزی زبان میں جو ادب لکھ رہی ہے اسے تھرڈ ورلڈ لٹریچر کا نام دیا گیا۔ انتظار حسین نے اس اصطلاح کے معنی سے بحث کی ہے۔ اپنے ایک اور مضمون 'آج کے آشوب میں ہمارا ادب' میں بھی انھوں نے تھرڈ ورلڈ لٹریچر کی اصطلاح پر غور کیا ہے اور اس صورت حال کی نشان دہی کی ہے، جس نے انگریزی ناول کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس مضمون میں کم وبیش وہی مسائل زیر بحث آئے ہیں جو پہلے مضمون میں

Scanned by CamScanner

ہم دیکھ چکے ہیں۔ البتہ بیسویں صدی کے وہ افکار و نظریات جو اکیسویں صدی میں بھی در آئے ان پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔:

> ''ہمارے زمانے کی جو فکر ہے اس سے ہماری ادبی روایت کو بے خبر تو نہیں رہنا چاہیے مگر یہ کیسے فلسفے ہیں کہ بحث مباحثے تک محدود رہتے ہیں مگر ان کی آنچ شعر اور افسانے تک نہیں پہنچتی۔ پتہ چلا کہ اکیسویں صدی کی مغربی دنیا میں افکار و تصوراتِ کی نمود اب بھی بہت ہے مگر تخلیقی شادابی کم کم ہے۔'' (ص 21)

انتظار حسین نے عصری صورتِ حال کو بہت اہمیت دی ہے۔ وہ روایت اور تاریخی تسلسل پر یقین رکھنے کے باوجود عصری صورت حال کو روایت کی نذر کرنے پر آمادہ نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ عصر حاضر میں تخلیق پانے والے ادب کو روایت کی روشنی میں دیکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔ بیسویں صدی تحریکات کے گلیمر کی صدی تھی۔ اس کی چمک دمک میں جو ادب لکھا گیا اس کا مطالعہ اکیسویں صدی کی تہذیبی سیاسی صورت حال کی روشنی میں کرنا درست نہیں ہوگا۔ ہاں کچھ مماثلتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ماضی حال اور مستقبل کو فکشن میں ایک ساتھ دیکھنے والا فن کار ادبی تنقید میں ماضی، حال اور مستقبل کو گڈ مڈ کرنے پر آمادہ نہیں، اسے تنقید کا فیضان نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ انتظار حسین نے اپنے فکشن میں عصری صورت حال کو بھی ماضی اور مستقبل کے سیاق میں ایک نیا مفہوم عطا کیا ہے۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

> ''اس وقت سے سفر کرتے کرتے اب ہمارا ادب اس زمانے میں پہنچ کر کس مرحلے میں ہے اور آئندہ اس کے کیا امکانات نظر آ رہے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تو دیکھنا پڑے گا کہ ہماری قوم، ہمارا معاشرہ تب سے اب تک کے سفر کے بعد کس مرحلہ میں ہے۔ کیوں کہ صورتِ حال

Scanned by CamScanner

کچھ اس طرح کی ہے کہ ہم ادب کے مستقبل پر غور کرتے ہوئے اس آشوب سے چشم پوشی نہیں کر سکتے جس سے یہ معاشرہ اب دوچار ہے۔ تشدد اپنے عروج پر ہے۔ گلیوں، بازاروں، مسجدوں، درگاہوں میں پھٹتے ہوئے بم، خودکش حملے، ٹارگٹ کلنگ آگ اور خون سے کھیلتے ہوئے احتجاجی جلوس، شعلوں میں لپٹی ہوئی عمارتیں، بسیں، کاریں، دکانیں۔'' (ص22)

شعروادب کا جامد تصور رکھنے والا شخص عصری شاعری کو موضوعاتی سطح پر تو اتنی وسعت سے ہم کنار دیکھنا نہیں چاہے گا۔ انتظار حسین معاشرے کی جن بدصورتیوں کا ذکر کرتے ہیں انھیں تخلیقات کا حصہ بنانا گویا نئی شعریات کی جانب قدم بڑھانا ہے۔ انتظار حسین کا یہ نظریہ ایک معنی میں ترقی پسند نظریہ بن جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر تخلیق کار اپنے بہترین لمحات میں ترقی پسند ہوتا ہے۔ لیکن دیکھیے انتظار حسین کس دھیرج اور خاموشی کے ساتھ عصری ادب کے مزاج کو بدلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ انتظار حسین کی وہ تخلیقی دنیا ہے جس میں مختلف آوازوں اور اسالیب کے لیے گنجائش ہے۔ وہ جب اپنے عہد کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو ان کی تخلیقی دنیا بھی اس میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انتظار حسین اگر فکشن رائٹر نہ ہوتے تو وہ اپنے عہد کی شاعری کو اتنی آزادی نہیں دے سکتے تھے۔ انتظار حسین کی نظر میں شعروادب کے مختلف رنگ اور اسالیب ہوں گے مگر وہ بار بار خواتین کی اس شاعری کا حوالہ دیتے ہیں جو بارود سے بھری ہوئی ہے۔ یہ وہی بم اور بارود ہے جس کا سب سے زیادہ سامنا خواتین نے کیا ہے۔ انتظار حسین ان حالات کا ذکر ایک سماجی اور انقلابی شخص کے طور پر کرتے ہیں، جس کی نظر میں عادتاً ادب لکھنا ایک طرح کی بے حسی بھی ہے اور بدذوقی بھی۔ کاش وہ لوگ انتظار حسین کی ان تحریروں کا مطالعہ کرتے جو لفظ کو لفظ سے

Scanned by CamScanner

شکار کرتے ہیں اور جن کی نظر میں شاعری ایک تکنیکی مشغلہ ہے۔ انتظار حسین نے چوں کہ معاصر ادب کو اپنے زمانے کے آشوب کے ساتھ دیکھا ہے لہٰذا انھیں یہ خیال نہیں گزرتا کہ جو ادب لکھا جارہا ہے وہ کس معیار کا ہے۔ معیار کا مسئلہ انتظار حسین کا بنیادی مسئلہ رہا ہے لیکن وہ ایک حساس تخلیق کار کی طرح مسائل پر گفتگو کرتے جاتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ، سماجی اور عصری حسیت کو رد کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار 'ادب کے ادبی معیار' کا فقرہ ہے۔ انتظار حسین عصری صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے تاریخ کی سمت نکل جاتے ہیں۔ اب یہی دیکھیے کہ وہ زہرا نگاہ کی ایک نظم جو لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق ہے، اس کا رشتہ علی گڑھ تحریک کے ذریعے قائم ہونے والے لڑکیوں کے پہلے اسکول سے قائم کردیتے ہیں۔ یعنی جس بات کی مخالفت اب ہورہی ہے اس کا آغاز تو بہت پہلے ہوگیا تھا:

> ''نظم ختم ہوئی اور میں حیران ہوکر سوچ رہا ہوں کہ یہ تو اسی کہانی کا نیا باب ہے جب علی گڑھ میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے مقصد سے پہلا اسکول کھلا تھا اور اس پر کتنا ہنگامہ بپا ہوا تھا مگر اب علی گڑھ پیچھے رہ گیا ہے اور بات مولانا حالی کی 'چپ کی داد' سے آگے نکل آئی ہے۔ یہ نئے نسائی شعور میں رچی ہوئی آج کی عورت کی آواز ہے۔'' (ص 23)

انتظار حسین جب پاکستان کی ادبی اور نظریاتی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہیں تو انھیں متحدہ ہندوستان کا خیال آتا ہے اور سب کچھ ٹوٹتا بکھرتا سا محسوس ہوتا ہے۔ ادبی اور تخلیقی نقطۂ نظر سے آزادی اور تقسیم کے بعد کی صورت حال ان کی ادبی نگاہ میں زیادہ پرقوت اور فعال تھی، لوگ ایک دوسرے کے خیال کو رد کررہے تھے مگر رد و قبول کے اس عمل میں جو ادب پیدا

Scanned by CamScanner

ہو رہا تھا اس میں زندگی تھی۔ کچھ یہی بات محمد حسن عسکری نے اپنے ایک کالم میں لکھی تھی۔
انتظار حسین نے اپنے تیسرے مضمون ادب، قومی شناخت اور کالا باغ ڈیم' میں چند ایسی ابتدائی تحریروں کا ذکر کیا ہے، جنہیں پاکستانی ادب میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً فیض کی نظم 'یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر' (2) منٹو کا افسانہ 'کھول دو' (3) ناصر کاظمی کی غزل۔ انہوں نے اس کے بعد منیر نیازی کا حوالہ دیا ہے۔ پاکستانی ادب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ابتدائی طور پر جن تخلیقات نے پاکستان میں اردو ادب کو ایک سمت عطا کی، ان کی نشان دہی میں انتظار حسین نے جذباتیت سے کام نہیں لیا۔ کچھ واضح نقوش ان کی نگاہ میں تھے ان ہی نقوش سے دیگر راہیں بھی روشن ہوئیں۔ انتظار حسین نے ناصر کاظمی کے دو شعر بھی درج کیے ہیں:

دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا
شاخوں پر جلے ہوئے بسیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منھ اندھیرے

دل چسپ بات یہ ہے کہ فیض کی نظم 'یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر' مندرجہ بالا اشعار یکساں طور پر ہندوستان اور پاکستان میں مقبول ہوئے اور کم و بیش انھیں ایک ہی سیاق میں دیکھا گیا، لوگ ان تخلیقات کو برصغیر کا مشترکہ ادبی سرمایہ مانتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اس پورے خطے کا آشوب شامل ہے، یہ اور بات ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے ان شعرا کا تعلق پاکستان سے ہے۔

'ہند مسلم تہذیب میں روشن خیالی کی روایت' اور ہند مسلم تہذیب اور موسیقی، یہ دونوں

Scanned by CamScanner

مضامین پاکستان کے ممتاز اداروں کی فرمائش پر لکھے گئے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انتظار حسین کے تہذیبی مسائل کس قدر مختلف ہیں اور وہ کیوں کر اپنے فکشن میں برصغیر کی تہذیبی روایت کی ٹوٹتی کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ انتظار حسین پاکستان کے قیام پر کسی طرح کی گفتگو نہیں کرنا چاہتے اور اب اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ البتہ وحدت کی تلاش تو انھیں کا حق ہے اور یہ حق ان سے کوئی چھین نہیں سکتا، اسی لیے انھیں اردو شاعری کے وہ نمونے یاد آتے ہیں جن میں مشترکہ کلچر کا اظہار ہوا ہے۔ اس کتاب میں ایک مضمون گیتا خلیفہ عبدالحکیم کے ترجمے میں بھی ہے۔ روشن خیالی کی روایت والے مضمون میں بھی انھیں خلیفہ عبدالحکیم کے ترجمہ کا خیال آتا ہے۔ انھیں حیرت ہے کہ خلیفہ صاحب رومی جی اور اقبال پر گراں قدر کام کرتے ہیں اور گیتا کا ترجمہ کرتے ہیں۔ آخر اس تثلیث کا جواز کیا ہے؟ پھر انھیں اس سوال کا جواب اردو شاعری کی روشن خیال روایت میں مل جاتا ہے۔ انتظار حسین نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کو دو تہذیبوں کے درمیان ملاپ کا وسیلہ بتایا ہے:

> ''ہوا یہ کہ اس سرزمین نے مسلمان فاتحین کے قدم جمانے سے پہلے صوفیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، شاہی دربار تو سجتے سجتے ہی سجے مگر خانقاہیں بہت جلد قائم ہو گئیں۔''(31)

انتظار حسین روشن خیالی کی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے من گھڑت سچائیوں پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔ وہ قیاسی بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں، مثلاً:

> ''مثلاً ہندومت کے مقدس صحیفوں کا احترام برحق یہ بھی ماننے میں کیا مضائقہ ہے کہ ہندومت کے سیاق وسباق میں سچائی کے حامل ہیں مگر

Scanned by CamScanner

جب مرزا مظہر جان جاناں ویدوں کو آسمان سے نازل ہونے والے
صحائف بتاتے ہیں اور اسلام کی مذہبی روایت کے حضرت جبرئیل کے
متوازی برہما کو ایک فرشتہ بتاتے ہیں جو اس وحی کو لے کر آیا تو یہ بات کسی
قدر دوراز کار نظر آئی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے یہ مفکرین
خلوص نیت سے اور وسعت قلب کے ساتھ اس مذہبی روایت کو سمجھنے کی
کوشش کر رہے تھے جس سے اب انھیں پالا پڑا تھا مگر یہ لازم نہیں ہے کہ
وسعت قلب کے نام پر ان کے ہر بیان کو ہر تعبیر کو ہم بے چوں چرا تسلیم
کرلیں۔'' (ص 34)

انتظار حسین نے اپنے مضمون 'مسلم تہذیب اور موسیقی' میں پاکستان کو ایک تاریخی اور
تہذیبی تسلسل کے طور پر دیکھا ہے مگر انہیں متحدہ ہندوستان کی تہذیبی روایت یاد آتی ہے جس کا
ایک اہم شاعر امیر خسرو ہے۔ تہذیب کو اپنے عقائد کے مطابق خالص بنانے کی کوشش
تعصب کو راہ دیتی ہے اور کوئی بھی تہذیب ہماری شرطوں پر پھل پھول نہیں سکتی۔ وہ لکھتے ہیں
کہ دیکھیے اقبال خود کو کافر ہندی کہتے ہیں:

کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلواۃ و درود لب پہ صلواۃ و دور

انتظار حسین نے ہندوستان میں آنے والے مسلمانوں کے بارے میں لکھا ہے:

''ویسے یہ نو واردان بھی یہاں آکر پہلے پہل حیران ہوں گے۔ اسلام کو
شاید پہلی مرتبہ کسی ایسی قدیم تہذیب سے واسطہ پڑا تھا جو ابھی اپنے قدیمی
دیومالا کے ساتھ پھول پھل رہی تھی۔ مندروں میں مورتیاں سجی تھیں، سنکھ

Scanned by CamScanner

پھونکے جا رہے تھے۔ گھڑ تالیں بج رہی تھیں۔ بھجن گائے جا رہے تھے۔
اس سارے منظر سے انھیں کفر کی بو آتی ہوگی مگر شاید اس میں کوئی ایسی
بات ہوگی کہ شاعر اس پر جلدی فریفتہ ہو گئے۔" (ص 38)

اس کے بعد انھوں نے غالب اور اقبال کے شعر درج کیے ہیں:

1) ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

2) ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

انتظار حسین نے، ایک بنیادی اور اہم مسئلے کو چھیڑا تھا ضرورت اس بات کی تھی کہ ایمان اور کفر کی کشمکش کی مثالوں کو اردو کی ابتدائی شاعری سے پیش کیا جاتا، غالب اور اقبال کا معاملہ تو بہت بعد کا ہے، وسیع المشر بی اور کشادہ ذہنی کی مثالیں ولی اور سراج کے یہاں مل جاتی ہیں۔ غالب کا کلیسا اس کفر سے مختلف ہے جسے انھوں نے مندروں سے وابستہ کر کے دیکھا ہے۔ انتظار حسین کو صوفیا کا خیال اس وقت لازماً آتا ہے جب وہ حکمرانوں، فاتحین کی جنگوں اور تلواروں کا ذکر کرتے ہیں۔ انتظار حسین واقعات کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے وہ موقع موقع سے قصہ گوئی کی جانب نکل آتے ہیں اور یہ قصہ گوئی خیال کی مسافت اور اس کی ساخت سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

"وہ تو جب جنگوں کا شور دھیما پڑا اور امن چین ہوا اور انھوں نے بستیوں
میں اپنے گھر بسا لیے تب مقامی خلقت نے دیکھا ہوگا اور دیکھ کر حیران
ہوئے ہوں گے۔ شمشیرزنوں سے الگ یہ کون سی مخلوق ہے اور یہاں کیا
کر رہی ہے اور یہ کس قسم کے جوگی ہیں کہ اپنے تکیے میں جمے بیٹھے ہیں اور
کسی آنے والے سے نہیں پوچھتے کہ تمہارا دین دھرم کا کیا ہے اور کس کی

مالا جپتے ہو۔'' (ص38)

انتظار حسین کو غالب کا شعر یاد آتا ہے جس کے متکلم کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے اور وہ جس جگہ بیٹھا ہے اس پر کسی کا اجارہ نہیں:

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

انتظار حسین نے اپنے اس مضمون کی فکری اساس امیر خسرو کی ہمہ جہت شخصیت پر رکھی ہے۔ظاہر ہے کہ یہاں بس کچھ اشارے ہی کئے جا سکتے تھے،انتظار حسین ان اشاروں میں فکشن کی شان پیدا کر دیتے ہیں۔وہ حقائق کو جس طرح بیان کرتے ہیں اس پر فکشن کے بیانیہ کا گمان ہوتا ہے۔اگر چہ امیر خسرو پر ایک دفتر موجود ہے،مگر انتظار حسین بار بار کی دہرائی باتوں کو اجنبیانے کے عمل سے گزار کر ہماری حیرتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں اور یہ کمال اس تہذیبی بیانیہ کا ہے جس نے انتظار حسین کو انتظار حسین بنایا:

> ''اس شخص کا عجب رنگ تھا۔ایک قدم دربار میں تھا،دوسرا قدم خانقاہ میں اور تیسرا قدم گلیوں بازاروں میں۔اس تیسرے قدم کی اپنی تفصیلات ہیں۔شاعر شیریں مقال طوطی ہند،ابھی دربار میں اپنی فارسی شاعری پر داد لے رہا تھا ادھر گلیوں کی مخلوق کی اپنی بولی ٹھولی ہے۔اس مخلوق کا تقاضہ ہے کہ فارسی کو فارسی والے جانیں ہماری بولی ٹھولی میں بھی کچھ ہو جائے اور بی چھونے کہ گلی کے نکڑ پہ اپنی دکان پر حقہ لیے بیٹھے تھی۔عجب تقاضہ کیا حقہ آگے بڑھاتے بڑھاتے بولی اے امیر تمہارے صدقے واری۔فارسی میں تم نے تو اتنے بول کہے،کچھ اس ہندی کے لیے بھی اس گری پڑی بولی

Scanned by CamScanner

میں کچھ کہہ دو اور یہاں آ کر شاعر شیریں مقال کو فارسی معلٰی کی بلندیوں سے اتر کر نیچے آنا پڑا۔'' (ص39)

انتظار حسین نے اپنے زمانے کو ایک ایسی صورت حال میں دیکھا ہے جسے بد قسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اسے وہ تہذیبی خوف کا نام دیتے ہیں۔ انھوں نے پاکستان کے سیاق میں ثقافتی حملہ اور تہذیبی خوف کی ترکیب استعمال کی ہے مگر دوسرے ملکوں میں بھی ان اصطلاحوں کو ان ہی معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تہذیبی خوف دراصل ایک سمٹی ہوئی دنیا ہے۔ انتظار حسین حسنِ مشترک پر ہونے والے حملوں کو حملہ کرنے والوں کا تہذیبی خوف کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنا مضمون اس جملے پر ختم کیا ہے'' ڈرنا چاہیئے اس وقت سے جب کوئی قوم تہذیبی خوف میں مبتلا ہو جائے۔ یہ اس کے زوال کے اشارے ہوتے ہیں۔'' انتظار حسین نے 'ادب، زبان اور تہذیب' میں بھی مشترکہ طرز فکر اور احساس کو برصغیر یعنی متحدہ ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت بتایا ہے، اردو زبان کو راہ اعتدال کا بہترین نمونہ کہا ہے۔ انتظار حسین نے تہذیبوں کے لین دین کو آمیزش، آویزش دونوں کا فطری عمل بتایا ہے۔ وہ کچھ میل جول کھٹ پٹ جیسے الفاظ بھی لکھتے ہیں۔ انتظار حسین کو دو تہذیبوں اور دو قوموں کے درمیان ہونے والی کھٹ پٹ میں زندگی کا حسن دکھائی دیتا ہے۔ پھر چیزیں دھیرے دھیرے اپنے مقام پر آجاتی ہیں اور خالص رنگ، خالص احساس وغیرہ کا مسئلہ خود ہی حل ہوجاتا ہے۔ لیکن کیا کہا جائے وقفے وقفے سے ایسے لوگ سامنے آتے جاتے ہیں جو ان نشانات اور مقامات کو منہدم دیکھنا چاہتے ہیں ان ہی نشانات اور مقامات سے انتظار حسین نے اپنے فکشن کا مواد اور مسالہ تیار کیا ہے۔ امیر خسرو سے بی چھمو کی یہ درخواست کہ اے

Scanned by CamScanner

امیر اس بندی کے لیے بھی اس گری پڑی زبان میں کچھ کہو، انتظار حسین کو ایک تہذیبی سفر کا آغاز نظر آتا ہے۔ جس طرح پروفیسر محمد حسن نے شیخ علی حزیں کی کتاب پر سراج الدین علی خاں آرزو کے اعتراضات کو ایک علمی واقعہ ہی نہیں بلکہ تہذیبی واقعہ بھی قرار دیا ہے اور اسے فارسی تہذیب اور اس کی برتری پر آخری کیل ٹھونکنا سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح انتظار حسین کو بی چھوکی درخواست ایک نئی تہذیبی بساط کے سمٹنے کا نقطۂ آغاز معلوم ہوتی ہے۔ انتظار حسین نے بالکل ایک نئی بات لکھنے کی کوشش کی ہے:

''جب بی چھو نے امیر خسرو سے یہ فرمائش کی تھی کہ اے امیر تم نے ہر طرح کے شعر لکھ کر انبار لگا دیے۔ کچھ اس لونڈی کے لیے بھی کہہ دو تو یہ فرمائش تھی یا ایک نئی ابھرتی ہوئی تہذیب کا اپنے وجود کو منوانے کا مطالبہ تھا۔'' (ص 58)

'اپنی دانست میں' کی چند تحریریں فکشن سے متعلق ہیں۔ ان سب کو اگر ایک ساتھ پڑھا جائے تو ایک بڑی تصویر ابھرتی ہے۔ اس تصویر میں ماضی کا چہرہ بھی ہے اور حال کو ماضی سے ملا کر دیکھنے کی خواہش اور مستقبل کی طرف سے ایک بے نیازی بھی۔ اس بے نیازی کو اس احساس نے جنم دیا ہے کہ ماضی اور حال کے مسائل اور پیچیدگیاں کیا کم ہیں کہ ہم مستقبل کا کوئی خاکہ اپنے فکشن یا فکشن کی تنقید میں بنائیں۔ انتظار حسین نے ہم عصر اردو شاعری کے بارے میں جو موقف اختیار کیا تھا اس میں بڑی لچک ہے اور وہ روایت سے ہٹا کر نئی شاعری خصوصاً خواتین کی شاعری کو دیکھتے ہیں۔ اپنے مضمون تہذیبی عمل اور کہانیاں، 'نئے پرانے فکشن کے گورکھ دھندے' میں بطور خاص تہذیبی عمل کو ایک رجحان کے طور پر دیکھا ہے۔ اس کا دائرہ وقت کے ساتھ پھیلتا جاتا ہے اور فکشن بھی اپنے دامن کو وسیع کرتا جاتا ہے۔ یوں تو

Scanned by CamScanner

انتظار حسین خود کو باضابطہ نقاد کہنے سے گریز کرتے ہیں مگر انھیں اس کا علم تو ہوگا ہی کہ وہ اپنے خاص اسلوب میں کچھ ایسا لکھ جاتے ہیں کہ وہ نظریاتی تنقید کا اہم نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ شاعری کی زبان اور کہانی کی زبان کیوں کر ایک دوسرے سے مختلف کردار ادا کرتی ہے۔ جب زندگی کی بے کرانی اور اس کی بکھری ہوئی کہانیوں کا خیال آتا ہے تو پھر کہانیاں ہی نظر آتی ہیں:

> ''سو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی تہذیب کے بطن سے جنم لینے والی کہانیاں شاعری سے بڑھ کر اس کی سفیر بن جاتی ہیں۔ شاعری کی مار وہاں تک ہوتی ہے جہاں تک زبان اس کا ساتھ دیتی ہے۔ مگر کہانی اپنی پیدائشی زبان کی اس حد تک محتاج نہیں ہوتی۔ جہاں تک زبان اس کا ساتھ دیتی ہے وہاں تک ماشاءاللہ سبحان اللہ۔ اس سے آگے وہ خود اپنی اندرونی طاقت کے زور پر چلتی ہے اور دور تک کا سفر کرتی ہے۔ لوک کہانیوں کا وطیرہ یہی رہا ہے وہ لوک کہانی بہت نصیبوں والی ہوتی ہے جو کسی اچھے اور سچے شاعر کے تصور میں سما جائے پھر وہ اس کے تخلیقی جوہر کے وسیلہ سے اعلیٰ تخلیقی اظہار کی سطح تک پہنچ جاتی ہے۔ جیسا کہ ہیر رانجھے کی کہانی کے ساتھ ہوا۔'' (ص 98)

کہانی کی زبان کی طاقت انتظار حسین نے یہاں تلاش کی ہے۔ تلاش کا یہی عمل علی سردار جعفری کی کتاب 'ترقی پسند ادب' کے ایک باب میں نظر آتا ہے۔ علی سردار جعفری عوامی روایت کی آگہی کو ہر بڑے تخلیق کار کے لیے لازم تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ فلاں شعر بڑا نہیں ہوسکتا تھا اگر شاعر کو زبان کی عمومی روایت کا علم نہ ہوتا۔ مجھے انتظار حسین اور علی سردار جعفری کے یہاں حیرت انگیز مماثلت نظر آتی ہے۔ اس باب میں وہ

Scanned by CamScanner

انتظار حسین ہی کی طرح اپنی زبانی روایت پر نازاں اور خوش ہیں۔علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''فردوسی، ناصر، خسرو، عمر خیام کی شاعری جو ایرانی قوم کے جذبۂ آزادی اور کسانوں، غلاموں اور دست کاروں کی بغاوت کے ساتھ وابستہ ہے۔ کبیر اور تلسی داس کی شاعری جو ہندوستان کے کسانوں اور دست کاروں کے جذبات کی آئینہ دار ہے۔ مراٹھی کسانوں کی بغاوت کے وقت مراٹھی شاعری (خصوصاً اس کی صنف پواڑا) اور پٹھانوں کی بغاوت کے وقت پشتو شاعری جس کا سب سے بڑا شاعر خوش حال خاں کھٹک تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے بہترین کارنامے اور شاہ کار اس وقت وجود میں آئے ہیں جب انھوں نے عوامی تخیل سے بال و پر حاصل کیے ہیں۔'' (ترقی پسند ادب، ص 46)

انتظار حسین نے زبانی روایت کا جہاں بھی ذکر کیا ہے اگر اسے علی سردار جعفری کی تحریر کے ساتھ ملا دیا جائے تو کچھ بدلے ہوئے اسلوب میں ایک ہی موقف کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ قصہ کہانیوں کے سلسلے میں علی سردار جعفری کا نظریہ شاعری کے مقابلے میں زیادہ کشادہ ہے۔ انتظار حسین فکشن کے حوالے سے اپنی روایت میں جو کچھ تلاش کرتے ہیں اس میں کوئی ترقی پسند نظریہ تیرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ مگر زندگی کے تمام تماشے انتظار حسین کو ترقی پسندوں کی طرح ہی اپیل کرتے ہیں مگر وہ اس زندگی کو زندگی کے دوسرے رنگ کی ضد قرار نہیں دیتے۔ ماضی کی طرف بار بار پلٹنے بلکہ ماضی ہی میں سانس لینے کی روش البتہ انھیں ترقی پسندوں سے الگ کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی روایت میں زندہ عناصر یا کم زور عناصر وغیرہ کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ لوک کہانیوں کی سب سے بڑی قوت اس کی آوارہ مزاجی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

"کہانیاں طبعاً آوارہ گرد ہوتی ہیں۔ لاکھ ان کا علاقے سے رشتہ
جوڑو۔ اپنے علاقے میں ٹکتی نہیں آوارہ پھرتی رہتی ہیں۔ گھاٹ
گھاٹ کا پانی پیتی ہیں۔" (ص100)

انتظار حسین نے اس سلسلے میں کچھ ٹھوس دلیلیں پیش کی ہیں کہ ایک ہی کہانی وقت کے ساتھ مختلف خطوں میں پہنچ کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ ادھر چند برسوں میں مابعد جدید تنقید نے داخلی سطح پر متن کی گردش اور معنی کی آوارگی پر خاصا زور دیا ہے۔ انتظار حسین زبانی روایت پر جس طرح گفتگو کرتے ہیں وہ بالآخر مابعد جدید تنقید کا ڈسکورس بن جاتی ہے۔ انھوں نے کہانیوں میں ان آوارہ گرد کہانیوں پر گفتگو کرتے ہوئے اس تصور کو رد کیا ہے کہ ہم ہمیشہ کوئی نئی کہانی لکھتے ہیں۔ گویا کوئی فن پارہ فکری ولسانی اعتبار سے خالص یا خود مکتفی نہیں ہے۔ ان میں مختلف زبانی روایات شامل ہیں۔ کسی کہانی یا قصے کا ضبط تحریر میں آنا بھی گویا ایک بین المتونی عمل ہے۔ اس موقعے پر مختلف متون گردش میں آجاتے ہیں۔ انتظار حسین نے "نئے پرانے فکشن کے گورکھ دھندے" میں حقیقت پسندی کو جس زاویے سے دیکھا ہے وہ نوآبادیاتی فکر کے خلاف ایک تہذیبی ایجنڈا معلوم ہوتا ہے۔ نئے افسانے کو بھی وہ کوئی بڑا انقلاب نہیں بتاتے اس کی وجہ روایت سے شعوری طور پر برأت کی کوشش ہے۔ انتظار حسین نے یہاں بھی اپنی مقامیت سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ داستانیں کسی نام نہاد سماجی اور افادی نقطۂ نظر کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ لیکن ان میں آنے والے فکشن کے بہت سے حقائق موجود تھے۔ لہٰذا جب انتظار حسین کو جنوبی امریکہ کے فکشن کے حوالے سے میجکل ریلزم، سرریلزم کی اصطلاح معلوم ہوئی تو انھیں اپنی داستانیں یاد آئیں۔ اس میں شک نہیں کہ داستانیں جادو سے بھری

Scanned by CamScanner

ہوئی ہیں اور جنوبی امریکہ کا فکشن جادوئی حقیقت نگاری میں ہماری داستانوں سے بے تعلق نہیں تھا۔ انتظار حسین عربی عجمی داستانوں اور کہانیوں کی مختلف روایتوں سے اپنا تخلیقی رشتہ قائم کرتے ہیں مگر پریم چند سے ان کی کوئی تخلیقی قربت ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ افسانوی روایت کی وسعت کے لیے ماضی کی ان کتھاؤں اور جادو بھری کہانیوں سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں چوں کہ ان کی نگاہ میں کہانی کی نیرنگیاں ہیں نہ کہ سماج کی اصلاح۔ لہٰذا ماضی اور روایت خزانے کی مانند ہے۔ انتظار حسین اپنی روایت یعنی ہندوستانی روایت کے ساتھ مغربی روایت سے بھی کہانیوں کو ثروت مند دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کے درج ذیل جملے مابعد جدید تنقید کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں:

> ''ایک وہ جو عرب و عجم سے آیا، دوسرا وہ جو قدیم ہند کی کتھا کہانی کی روایت سے نکلا اور اس روایت سے آملا۔ تیسرا وہ جو مغربی فکشن سے بہتا آیا اور ہمارے افسانوی شعور پر چھا گیا۔ یہ تین دھارے جو اپنا اپنا تہذیبی مزاج رکھتے ہیں اور اپنے جلو میں افکار و تصورات کی رنگا رنگ دولت لائے ہیں یہاں ایک دوسرے سے گھل مل کر ایک تنوع بھی پیدا کرتے ہیں اور اس روایت کو وسیع القلبی ایک لبرل مزاج بھی عطا کرتے ہیں۔'' (ص 46-45)

'یہ کہانیاں' کے عنوان سے انتظار حسین نے نہ صرف اپنی کہانیوں کے تہذیبی سروکار پر گفتگو کی ہے بلکہ مجموعی طور پر اردو کہانیوں کو بدلتے مزاج کے ساتھ بھی دیکھا ہے۔ اس مضمون کو اردو کہانی کی تنقید کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ اردو کہانی کو خود کہانی کار نے کس طرح دیکھا ہے اس سلسلے میں انتظار حسین کی یہ تحریر سب سے مختلف ہے۔ پریم چند سے لے کر بلراج

Scanned by CamScanner

مین راتک نے کہانی کو اپنی اپنی نظر سے دیکھا۔ انتظار حسین کا مسئلہ ابتدا ہی سے مختلف تھا گو کہ کرشن چندر انھیں ابتدا میں بہت اچھے لگتے تھے اب بھی ان کے ہاں کرشن چندر کے لیے ایک نرم گوشہ ہے۔ کرشن چندر کے اثر سے باہر نکالنے کا کام محمد حسن عسکری نے کیا۔ انھوں نے خود ہی اس بارے میں لکھا ہے۔ مجموعی اعتبار سے انتظار حسین کو نہ پریم چند کی نئی حقیقت نگاری سے گہری نسبت ہے اور نہ ہی ترقی پسندوں کی ترقی پسندی سے اور نہ جدیدیت کی تجریدیت سے۔ انتظار حسین کے یہاں پریم چند کی روایت یا ترقی پسندی کا اثر یا پھر جدیدیت کا کوئی نقش اگر نظر آتا ہے تو یہ ایک فطری عمل ہے لیکن گزشتہ نصف صدی کا عرصہ انتظار حسین کے لیے خاصا آزمائشوں سے بھرا رہا ہے۔ انھیں کسی عہد کے حاوی رجحان میں فٹ نہیں کیا جا سکا۔ ان پر ماضی پرستی کا الزام ان لوگوں نے بھی لگایا جو ماضی کو ٹھیک سے سمجھ نہیں سکتے تھے۔ ترقی پسندی کی روایت اور پھر جدیدیت ان دونوں کے درمیان انتظار حسین کا فن اپنی روش پر قائم اور توانا نظر آتا ہے۔ انتظار حسین کی ان آزمائشوں کا حوالہ دوں گا جن سے سرخرو گزر پانا ہر ایک کے بس میں نہیں ہے۔ انتظار حسین کے فکشن کی بنیاد نہایت مستحکم تھی۔ اس میں ہماری تاریخی اور تہذیبی زندگی کے اتنے دھارے اور سلسلے آملے تھے جنھیں رد کرنا اور چھوٹا ثابت کرنا اپنی چھوٹائی کا ثبوت دینا ہے۔ کمال یہ ہے کہ انتظار حسین ان انتہاؤں کے درمیان اجنبی کبھی نہیں رہے۔ ان کا مکالمہ ترقی پسندوں سے بھی رہا اور غیر ترقی پسندوں سے بھی۔ 'یہ کہانیاں' کے عنوان سے انھوں نے اردو کہانیوں کے نظری و عملی مسائل کو سمیٹ لیا ہے۔ ہماری موجودہ تنقید شدت سے بین المتونیت پر اصرار کر رہی ہے۔ انتظار حسین نے اپنی کہانیوں کے تاریخی و تہذیبی سیاق کی جانب جس طرح اشارے کرتے رہے ہیں وہ دراصل مابعد جدید تنقید کو

Scanned by CamScanner

استحکام بخشنے کی ایک تاریخی کوشش بھی تھی۔ انتظار حسین نظری اور عملی طور پر جس تصور ادب اور تصور تہذیب کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں اسے شاعری کی تنقید میں ''مضمون پر مضمون'' بنانے کا نام دیا گیا ہے۔ مابعد جدید تنقید اس عمل کو بین المتونی کہتی ہے۔ افسانے کے تعلق سے یہ کام انتظار حسین نے کیا:

''ویسے تو پہلے بھی اس ذخیرے سے کہانیاں چنتا رہا ہوں مگر نئے زمانے کے تعصبات بیچ میں کھنڈت ڈال دیتے تھے۔ ایک تو نئے زمانے کی افسانوی روایت نے ہمیں یہ پٹی پڑھائی ہے کہ کہانی طبع زاد ہونی چاہیے۔ جو کہانی تم نے اپنے دماغ سے اتاری ہو ایسے لکھو وہ تمہاری ہے اگر اگلی پچھلی کہانیوں سے کوئی کہانی اُچک کر تم نے لکھی ہے تو وہ تمہاری روایت کا حصہ ہوا کرے۔ وہ تمہاری نہیں بن سکی۔''(47-48)

انتظار حسین نے کئی مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ اپنی بساط بھر تہذیب کی اس بہتی گنگا سے حاصل کیا ہے مگر میں شناوری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ذرا درج ذیل اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے:

''وہاں تو کتھا سمندر امنڈا ہوا ہے۔ تم نے کتنی شناوری کی ہے۔ کتنا لے پاؤ گے۔ اور پھر قلم میں زور کتنا ہے۔ انفرادیت کی مہر ایسے ویسے تھوڑی ہی لگ جاتی ہے اور ہاں شناوری کے بھی دو رنگ ہیں۔ 'کتھا کہانی' کا یہ سمندر دو صورتوں میں امنڈا ہوا ہے۔ تحریری اور سماعی۔''(ص 48)

روایت تو سب کے لیے یکساں ہے، اس سے استفادہ کا معاملہ ذہنی و فکری استعداد پر ہے۔ تحریری اور سماعی دونوں روایات سے ہم خود کو الگ نہیں کر سکتے۔ بعض اوقات تحریر میں زبانی روایت در آتی ہے۔ انتظار حسین نے ایک بنیادی سوال اٹھایا ہے کہ پرانی کتھا کو نئے

Scanned by CamScanner

زمانے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کتنی اہم ہے۔ یہ سوال ان حضرات کو خوش کرنے کے لیے ہے جو ماضی کو حال کے لیے انتخابی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

انتظار حسین نے جاتک کتھاؤں اور گوتم بدھ سے جس طرح ایک تخلیقی رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے اردو میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ عموماً گوتم بدھ کی خاموشی کو ایک طاقت اور فلسفہ کی شکل میں تو دیکھا گیا مگر جاتک کتھاؤں کے مکالمے کو کم ہی موضوع بنایا گیا۔ انتظار حسین اس خوشی کے ساتھ مضمون کا آغاز کیا ہے کہ کسی بھلے مانس کو خیال تو آیا کہ مہاتما بدھ کی جاتک کتھاؤں کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ انتظار حسین ان جاتک کتھاؤں کا پس منظر بتاتے ہیں پھر بھکشوؤں کے سوالات اور مہاتما کے جوابات کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔ انتظار حسین نے یہاں ایک اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے:

> ''مہاتما بدھ یہاں خالص کہانی کار ہیں۔ کہانی کے بہانے وہ کوئی وعظ نہیں دیتے وہ فریضہ وہ الگ انجام دیتے ہیں۔ وعظ اور کہانی کار یہاں گڈمڈ نہیں ہوتے ہیں۔ اگر کہانی سے کوئی اخلاقی سبق نکلتا ہے وہ از خود برآمد ہوتا ہے۔ مہاتما بدھ تو بس کہانی سنا رہے ہیں۔'' (ص 119)

انتظار حسین کا مسئلہ مہاتما بدھ اور ان کے بھکشوؤں کا عقیدہ نہیں ہے۔ ان کی تو دلچسپی قصہ گوئی اور اس سے وابستہ دردمندی میں ہے۔ گوتم بدھ ہر نئے جنم میں نئی مخلوق کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ جنم جنم کا یہ سلسلہ انھیں رحمت کا استعارہ بناتا ہے۔ مختلف جنموں کی یہ روداد انتظار حسین کی نگاہ میں ایک آپ بیتی بھی ہے۔ اس سے سوانحی خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے مگر یہ کیسی آپ بیتی ہے جو ہماری حیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ حکمت اور معنی کا ایک ایسا ماخذ ہے جسے

Scanned by CamScanner

انتظار حسین نے زندگی کا نام دیا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ لفظ زندگی ان جنموں کے سیاق میں کتنا باوقار معلوم ہوتا ہے۔ یہ آپ بیتی انتظار حسین کی نظر میں دراصل دوسروں کے لیے ہے۔اس میں جو کچھ ہے وہ وجودی تو ہے لیکن یہ وجود اپنی ذات سے ماورا اور بے نیاز بھی ہے۔انتظار حسین نے کہا ہے' آوا گون' میں ایمان رکھنے والے کہتے ہیں کہ انسانوں میں بس ایک ہی انسان ایسا گزرا ہے جسے اپنے اگلے پچھلے سارے جنم یاد تھے وہ مہاتما بدھ تھے'' ان جاتک کتھاؤں کو ان لوگوں نے بھی پڑھا ہوگا جن کے لیے نئے زمانے کے مسائل زیادہ اہم ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں اس میں اپنی کہانی اپنے طریقے سے لکھنی چاہیے۔ اصل میں تعبیر اور استفادے کا عمل قاری کے اوپر ہے۔انتظار حسین کو یہ جاتک کتھائیں آج کی کہانی سے زیادہ پراسرار اور بامعنی دکھائی دیتی ہیں۔ان میں نئے زمانے کے مسائل کو حل کرنے کا شعور بھی پوشیدہ ہے مگر اس شعور کو مذہبی رنگ دینے کے بہ جائے صرف ایک زاویہ کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ کہانی سننے اور سنانے والا ایک دوسرے سے کتنا قریب ہے۔ انتظار حسین نے آوا گون کو ایک تخلیق کار کی نظر سے دیکھا ہے۔ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں عقیدہ ان کا مسئلہ نہیں ہے۔انسان اشرف المخلوقات ہے مگر کائنات میں دیگر مخلوقات بھی ہیں ان سب سے کائنات مکمل ہوتی ہے۔ ایسے میں گوتم بدھ کا الگ الگ مخلوقات کے روپ میں جنم لینا، پھر نئے سرے سے زندگی اور اس کی کہانی کا آغاز کرنا دراصل زندگی کا مسلسل سفر میں رہنا ہے اسی لیے معنی کا عمل بھی کسی مقام پر ٹھہرتا نہیں۔انتظار حسین گوتم بدھ کی تعلیمات اور مکالموں میں اپنے زمانے کی شدت پسندی کا ازالہ دیکھتے ہیں۔ انتظار حسین نے جاتک کتھاؤں سے دو سطحوں پر مکالمہ قائم کیا ہے۔ ایک تو اس کی فکری اور فلسفیانہ جہت ہے اور دوسری اس کا

Scanned by CamScanner

اسلوب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فکری پہلو کو دہشت کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یعنی تشدد کا جواب تشدد نہیں ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کہانی کے اسالیب کی تلاش میں مغرب کی طرف دیکھنے کے بہ جائے مشرق کی جانب دیکھنا چاہیے۔ انتظار حسین نے لکھا ہے:

> ''کسی کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ پرانے زمانے کا یہ ایک گیانی ایدیش دیتے دیتے کہانی سنانے پر کیوں اتر آتا ہے۔ ایدیش اپنی جگہ موثر ہیں۔ خلقت ان سے اثر لے رہی ہے مگر ایدیشک لگتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی نئے اظہار کی تلاش میں ہے۔ اس کی بصیرت اسے کیا عجب راستہ دکھاتی ہے اور اس سے کس قسم کا اظہار جنم لیتا ہے۔ ان کہانیوں کو اس زاویے سے ہمیں دیکھنا چاہیے۔''(ص120)

انتظار حسین کے زمانے میں افسانے کے جتنے اسالیب سامنے آئے ان کے بارے میں الگ الگ رائے ہو سکتی ہے۔ لیکن انتظار حسین نے جدیدیت سے متاثر افسانوی اسالیب کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا جائے تو جدیدیت نے افسانے میں جن اسالیب کو فروغ دیا ان سے انتظار حسین کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ انتظار حسین کے ذہن میں اخلاقیات کا تصور پوری انسانیت سے وابستہ ہے اور انھیں افسانے کی زبان اور خیال کو کہیں سے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ ضروری نہیں کہ تجریدی افسانہ نام نہاد سماجی اور افادی نقطۂ نظر کا حامل ہو۔ اس کے باوجود انتظار حسین کو تجریدی افسانے زندگی سے دور معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا مضمون 'منشا یاد بہ مقابلہ تجریدی افسانہ' اسی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔ یہ ایک مختصر سا مضمون ہے مگر بڑا اختلافی بھی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ اختلاف بھی کچھ اس انداز

سے کرتے ہیں کہ مار دھاڑ کا گمان نہیں ہوتا۔ جدیدیت کے علم بردار شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانے کو جیسا بنانا اور دیکھنا چاہا اور اس تعلق سے انور سجاد کو جس طرح انھوں نے اہمیت دی یہ تمام مسائل ایک طویل مقالے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ انتظار حسین نے دو صفحے میں ممکنہ تمام پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے۔ تجریدی افسانہ انھیں پسند نہیں۔لیکن وہ ناکام اور فیشن زدہ تجربوں سے بھی لطف اٹھا سکتے ہیں، وہ ناراض بھی ہوتے ہیں اور مسکرا بھی دیتے ہیں۔ کس خوب صورتی کے ساتھ انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کی قیادت کو تاریخ کا حصہ بنادیا ہے۔ گویا شمس الرحمٰن فاروقی نے جس انور سجاد کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا وہ آج کہاں ہے۔ یا اسے کتنے لوگ آج پہلے کی طرح پڑھتے ہیں۔ انتظار حسین نے کھل کر یہ بات لکھی کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے تجریدی افسانے کی حمایت کیوں کی۔ خود انتظار حسین اسلوب کی بات کرتے کرتے زندگی کے کسی مسئلے اور موضوع کی طرف نکل آتے ہیں۔ اور پھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلوب بھی تو مسئلے اور موضوع کا ہی زائیدہ ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ترقی پسند افسانے کے افادی اور سماجی نقطۂ نظر کو کوئی چیلنج کرسکتا تھا تو یہی تجریدی اسلوب تھا۔ وہ مظفر علی سید کو یاد کرتے ہیں کہ انھوں نے منشا یاد کے ایک افسانے کو پریم چند کے افسانے 'کفن' سے لڑا دیا تھا۔ انتظار حسین کا خیال ہے کہ ہر نیا تجربہ قربانی مانگتا ہے۔ تجریدی افسانہ لکھنے والوں نے بھی قربانی دی۔ اسی سے اظہار کی نئی راہیں کھلتی ہیں:

> ''ادب میں تجربوں کا سلسلہ تو رہنا چاہیے ہی مگر ہر نیا تجربہ قربانی مانگتا ہے۔ ایسے لکھنے والے ہوتے ہیں جو اس راہ میں اپنی قربانی دیتے ہیں اور ایک نئے اظہار کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔ آخر خودکش حملہ آور بھی تو جانیں دے کر ثواب

Scanned by CamScanner

کماتے ہیں۔ تجریدی افسانہ لکھنے والوں نے جدیدیت کے نام پر اپنے افسانے کی قربانی دے کر ثواب کمایا اور ایک خیالی جنت میں اپنا گھر بنایا۔'' (ص186)

تجریدی افسانہ نگاروں کو اس سے زیادہ مہذب انداز میں 'دیکھو مجھے دیدۂ عبرت نگاہ ہو' کا مصداق ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انتظار حسین کے قلم کا جادو ہے جس میں ان کا غصہ ایک تہذیب کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ خیالی جنت میں جگہ بنانا بھی کیا جگہ بنانا ہے۔ اس جملے میں تجریدی افسانے کا پورا المیہ سمٹ آیا ہے۔ ایسے تجریدی افسانہ نگاروں کو خودکش حملہ کرنے والوں سے مشابہ بتانا ایک گہرا طنز ہے۔

انتظار حسین ایک فکشن رائٹر ہیں اور ان کی نگاہ میں فکشن صرف وہی نہیں ہے جسے ناول اور افسانے کے نام سے لکھا گیا ہے۔ اس نظر نے اردو کے متون کو ایک نئی جہت عطا کر دی ہے۔ اس کی ایک اہم مثال ان کا مضمون 'آبِ حیات سے فلسفۂ الٰہیات تک' ہے۔ کوئی سکہ بند نقاد ہوتا تو آب حیات کو تحقیقی و تنقیدی نظر سے دیکھ کر اس کی زبان اور اسلوب سے بحث کرتا۔ انھیں وہ واقعہ یاد آتا ہے جب کسی کے پوچھنے پر انھوں نے کہا تھا کہ اردو میں پہلا بڑا ناول 'آبِ حیات' ہے۔ انتظار حسین کے اس بیان پر بحثیں ہوئیں اور اسے ایک فکشن رائٹر کی ذہنی اختراع بتایا گیا۔ فلسفۂ الٰہیات محمد حسین آزاد کے دور جنوں کی یادگار ہے۔ عالم جنوں کا سلسلہ کب شروع ہوا اور اس نے ان کی تحریروں کو کس طرح متاثر کیا ان مسائل پر لوگ غور کرتے رہے ہیں۔ انتظار حسین نے فلسفۂ الٰہیات سے پہلے آب حیات پر گفتگو کرتے ہوئے وسط ایشیا کے اس سفر کا ذکر کیا ہے جو محمد حسین آزاد نے برطانوی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس سفر کی روداد محمد حسین آزاد کے پوتے آغا محمد اشرف نے بیان کی ہے۔

Scanned by CamScanner

انتظار حسین نے لکھا ہے:

''چراغ کی مدھم روشنی میں انھیں اچانک احساس ہوا کہ ایک اجنبی ان کے بالمقابل بیٹھا ہے۔ انھوں نے اس کی صورت دیکھی اور چونکے۔ پھر غور سے دیکھا ارے یہ شخص تو میرا ہم شکل ہے۔ عین.......... میں بلوں اور سارے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی پھر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا ور ہمت کر کے پوچھا۔ اے عزیز تیرا نام کیا ہے۔ میرا نام اس نے گمبھیر آواز میں کہا ''محمد حسین ہوں۔''

آزاد کو ایک دہشت نے آلیا۔ فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور سرائے سے نکل کر سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔'' (ص 102)

انتظار حسین نے اس واقعہ کو محمد حسین آزاد کی دیوانگی کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے۔ عموماً محمد حسین آزاد کی دیوانگی کو ایک مخصوص عہد کی پیداوار بتایا جاتا ہے۔ انتظار حسین نے محمد حسین آزاد کے جنوں کو بھی تسلسل میں دیکھا ہے۔ اس شعور کے پیچھے نقاد کا نہیں بلکہ تخلیق کار کا شعور پوشیدہ ہے۔ انتظار حسین محمد حسن عسکری سے اپنی ایک گفتگو کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی تحریروں کے بارے ان کا یہ کہنا ہے:

''مولانا نے دیوانگی بھی نئی تکنیک میں کی ہے۔ یہ کہتے کہتے کسی قدر سنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے عجب ہے جو....... نے ہوش وحواس میں رہ کر کتنے تردد سے جس تکنیک کو برتا تھا اسے آزاد نے عالم دیوانگی میں کس بے تکلفی سے استعمال کیا ہے۔'' (ص 103)

دیوانگی کی بے تکلفی ہوشیاری کی بے تکلفی سے زیادہ فطری ہوتی ہے۔ اس بے تکلفی

Scanned by CamScanner

میں معنی کا تسلسل اور اس کی منطق کو یوں تلاش کرنا نادانی ہوگی۔ انتظار حسین کی دل چسپی کا سبب محض بے تکلفی، بے ربطی نہیں بلکہ معنی کا انتشار اور اس کی بے یقینی ہے۔ دیوانگی کی تکنیک کیا نئی بھی ہوسکتی ہے۔ محمد حسن عسکری نے جوائس کے مقابلے میں محمد حسین آزاد کو اسی لیے فائق ٹھہرایا ہے کہ محمد حسین آزاد کی دیوانگی کسی ہوشیاری کی تلاش میں نہیں ہے۔ جوائس کی ہوشیاری دیوانگی کی اس سطح کو نہیں پہنچتی۔ انتظار حسین ایک بنیادی سوال کرتے ہیں۔ ''اور میں سوچ رہا ہوں کہ آزاد کا تعلق فکشن سے کہاں جا کر قائم ہوا ہے'' کیا دیوانگی کے عالم میں غیر منطقی باتیں عالم ہوش کی تحریروں کا کسی نہ کسی طور میں حصہ بننے والی تھیں، ظاہر ہے کہ انتظار حسین آب حیات کو اگر بڑا ناول کہتے ہیں تو اس میں ان کے جنوں کا کوئی براہِ راست عمل نہیں دیکھتے۔ لیکن ''آبِ حیات'' میں ایک ایسی خوبی ہے جو انھیں آزاد کی دیگر تحریروں میں بھی دکھائی دیتی ہے اور وہ ہے قصہ گوئی۔ یا خیال کی مسافت۔ انتظار حسین کو ''آب حیات'' میں دو ایسی خوبیاں نظر آتی ہیں جو اسے ناول سے قریب کر دیتی ہیں۔ (1) ایک تخلیقی ذائقہ اور دوسرے اس کے جیتے جاگتے کردار۔ آب حیات لکھتے وقت محمد حسین آزاد کے ذہن میں کیا کچھ تھا اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، لیکن یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ وہ اردو شعر وادب کی تاریخ اور تذکرہ لکھنے بیٹھے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ''آب حیات'' کا جو متن ہے وہ محمد حسین آزاد کے منصوبے سے کتنا مختلف ہے۔ شاید محمد حسین آزاد کو بھی معلوم نہیں تھا کہ آب حیات ادبی تاریخ نگاری کے علاوہ اور کیا کچھ ہو جائے گی۔ ''آب حیات'' کی اس شکل کی تعمیر میں اس زبان نے اہم کردار ادا کیا ہے جسے ہمارے ناقدین تحقیقی وتنقیدی زبان کے منافی تصور کرتے ہیں۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

''وہ اردو شاعری کی تاریخ ہی لکھنے بیٹھے تھے مگر اپنے تخلیقی جوہر کو جوانھیں بہ طور
خاص ودیعت ہوا تھا، اسے وہ کہاں لے جاتے۔ تو انھوں نے اس پوری تاریخ
کو اس کٹھالی میں انڈیل دیا۔ وہاں سے تپ کر جو شئے برآمد ہوئی وہ تاریخ بھی
تھی مگر تاریخ سے بڑھ کر بھی ایک شئے بن گئی۔'' (ص 104-103)

انتظار حسین اس کے بعد ''آب حیات'' میں اردو شاعری کے مختلف ادوار اور شعرا کی پیش کش میں ناول کے اسلوب کو دیکھتے ہیں۔ اس اسلوب کی یہ طاقت ہے کہ شعرا زندہ کرداروں کی مانند ہمیں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مقام پر انتظار حسین کو شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول 'کئی چاند تھے سرآسماں' اور ان کے افسانے یاد آتے ہیں:

''وہ جو انھوں نے اپنے افسانوں میں مختلف شاعروں کی شخصیتوں کو
افسانوی کرداروں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اس سے
آگے بڑھ کر ایک پورے ادبی عہد کو ناول کی سطح پر بیان کرنے کی کوشش کی
ہے اس سب کے پیچھے پیچھے مجھے مولانا محمد حسین آزاد اپنی آب حیات بغل
میں دبائے کھڑے نظر آتے ہیں۔'' (ص 104)

شمس الرحمٰن فاروقی کا اسلوب محمد حسین آزاد سے بالکل مختلف ہے اور ان دونوں کے درمیان زمانی فاصلہ بھی بہت ہے لیکن انتظار حسین نے ایک ایسی مماثلت کی جانب اشارہ کیا ہے جس سے انکار مشکل ہے۔ جن شخصیات کو محمد حسین آزاد نے بہ طور خاص آب حیات میں پیش کیا ہے وہ شمس الرحمٰن فاروقی کے لیے بھی اسی قدر اہم نہیں ہو سکتے تھے مگر ادبی شخصیات کو زندہ کردار بنا دینا دونوں کا کارنامہ ہے۔ انتظار حسین نے داغ سے متاثر ہونے کا سبب ان کی شاعری کو نہیں بلکہ اقبال کے مرثیہ داغ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول 'کئی چاند تھے سرآسماں'

میں داغ کی والدہ کے ذکر کو بتایا ہے۔آب حیات کے بعد فلسفۂ الٰہیات کو پڑھنا اور اس کے بارے میں رائے دینا ایک مشکل کام ہے۔اس کتاب چہ کا آخری صفحہ انتظار حسین نے پیش کیا ہے۔اس میں ایک نام مرلی جے چند کا آتا ہے:

"مری مہاراج میں کیا عرض کروں۔ جو حضور سے ارشاد ہو وہی ہو، اچھا ہم کہتے ہیں اے میرے ایشور، تو نے کہا، تو نے لکھوایا، مجھ میں کیا طاقت تھی تو نے کہا بس یہی خاتمہ ہوگیا۔ ہاں (پروفیسر آزاد) لکھ آج ہے 22 ماگھ بدی سمت 1153 جنوری کی پہلی 1896 عیسوی ربیع الثانی کی 126 1316 ہجری۔ دن ہے بدھ کا۔ دیکھ یہ ہے معجزہ ہمارا۔ چار ہزار برس بعد ہم نے اس کتاب کو تجھے لکھوایا۔ سنہ مہینے، مہینوں، کی تاریخیں، دن کسی میں فرق نہیں۔ یہ ہے ہماری حکمت، جب ہم اتنا فلسفہ کام میں لائیں گے۔ ٹھیک وہی وقت ہوگا جو ہم وعدہ کر چکے ہیں۔ یہی ہے یہی ہے بہت۔ (ص 107)

انتظار حسین اگر چاہتے تو اقتباس کے بعض جملوں کا تجزیہ کر کے انھیں مختلف اقوال کا نام دے سکتے تھے لیکن انھوں نے ایک ایسی بات تلاش کر لی جو دیگر باتوں سے زیادہ اہم ہے۔ یعنی سری جے چند کون ہیں جنھیں محمد حسین آزاد، مہاراج کے طور پر مخاطب کرتے ہیں۔ انہیں داراشکوہ کی 'جوگ بشسٹ' یاد آتی ہے۔ 'جوگ بشسٹ جس کے آغاز میں داراشکوہ نے خواب میں رشی بشسٹ اور رام چندر جی سے ملاقات کا احوال لکھا ہے۔ یہاں کئی عالم ہیں پروفیسر آزاد کو درشن دیتے ہیں۔ یہ عالم خواب تو نہیں ہے مگر عالم بیداری بھی نہیں ہے پھر کون سا عالم ہے۔ عالم دیوانگی؟ نہیں یہاں مجھے غالب کا ایک شعر یاد آ تا رہا ہے:

Scanned by CamScanner

کوئی نہیں ہے اب اتنا جہاں میں غالب
کہ جاگنے کو ملا دیوے جا کے خواب کے ساتھ

''شاید یہ ہے وہ عالم جس کی غالب نے تمنا کی تھی اور جس نے آزاد کے یہاں آ کر ظہور کیا۔ اس عالم میں چار ہزار برس بعد سری رام چندر جی نے پروفیسر آزاد کے روپ میں جنم لیا اور اردو میں کچھ نئے اشلوک لکھنے شروع کیے یا کوئی نئی رامائن۔'' (ص 105)

''فلسفۂ الٰہیات'' کو نئے اشلوک اور نئی رامائن کہا جائے یا نہ کہا جائے اس میں اختلاف تو ممکن ہے مگر انتظار حسین کی تخلیقی آگہی ہی فلسفۂ الٰہیات میں چندر جی کو رام چندر جی کے طور پر دیکھ سکتی تھی، اور پھر اس منتشر اور بے ربط خیالات میں معنی کے مجموعے کو منتشر اور بے ربط کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اکثر اوقات نقاد کا منطقی ذہن فن پارے کو اس سطح پر نہیں دیکھ پاتا یہ سطح بصیرت کی ہے۔ انتظار حسین کا کمال یہ ہے کہ وہ عمومی حقائق میں کوئی نیا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ اب یہی دیکھیے ان کی ایک ''تحریر سرسید سے پہلے اور سرسید کے بعد'' ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے سماجی اور تہذیبی مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ سرسید کی روشن خیالی اور تدبر کی انھوں نے تعریف کی ہے اور ان سے ناراض اور خوش رہنے والوں کا حوالہ دیا ہے۔ جامعہ کے قیام کو عموماً سرسید کی انگریز پرستی کا ردعمل بتایا جاتا ہے۔ اور اس کے کچھ ٹھوس حقائق بھی موجود ہیں۔ لیکن جامعہ جن مشکلات سے گزری اور ان حالات میں اساتذہ نے جو تعاون پیش کیا، انتظار حسین اسے بھی سرسید کے مشن کا ہی فیضان بتاتے ہیں یعنی سرسید مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جس قدر کوشاں تھے اس نے جامعہ کی صورت میں بھی اپنا اظہار

Scanned by CamScanner

کیا۔ گویا مخالفتوں کے درمیان بھی سرسید کی فکرمندی اپنا کام کررہی تھی اوراس لحاظ سے محمد علی جوہر، اجمل خان اور دیگر مفکرین کا اخلاص سرسید سے الگ نہیں تھا۔ سرسید نے مذہبی معاملات میں دخل دے کر اپنے لیے بڑے مسائل پیدا کر لیے ہیں، انتظار حسین کا کہنا ہے کہ سرسید جیسا روشن خیال اور بے خوف لیڈر کسی ایک مسئلے تک خود کو محدود نہیں کرسکتا مثلاً گویا سرسید کی فکر کو ایک ایسی تحریک کے طور پر دیکھتے ہیں جس کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے ہے اور تحریک اسی وقت تحریک بنتی ہے جب وہ اختصاصی اور انتخابی رویہ اختیار نہ کرے۔ ●●

ہماری پوری شعری فکر ابھی تک کم و بیش اسی زبان میں بندھی ہوئی ہے، جسے ہم جاگیرداری سماج کی زبان کہتے ہیں۔ اگرچہ زندگی کے وہ سب لوازمات بدل گئے ہیں جن کا تعلق اس سماج سے تھا۔ نہ ہم اس طرح رہتے ہیں، نہ اس طرح مکان بناتے ہیں۔ نقل و حرکت کے ذرائع بھی وہ نہیں رہے۔ ہمارا لباس بھی وہ نہیں۔ مگر ہماری تشبیہیں، استعارے، تلمیحات اور شعری لوازمات وہی ہیں۔ ہم شاعری کو ابھی تک محفل کی چیز سمجھتے ہیں اور اس کی اچھائی کا انداز و صرف سن کر لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب خریدنے کی عادت نہیں۔ کتاب خرید کر پڑھنا ہمارا قومی مزاج اور کردار نہیں بنا۔ کم از کم اردو کی صورت حال یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری کے مزاج میں ابھی تک علمی سنجیدگی نہیں آئی، اور اس کا اظہار ابھی تک رومانی ہے۔ ہمارے بڑے سے بڑے شاعر کی کوشش یہ ہے جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنادے۔ بات چاہے جہاں سے نکلے اسی کی جوانی تک پہنچ جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پوری شاعری ابھی دنگی بازی کی نظر ہورہی ہے۔ یار لوگ بیٹھے ہیں، معشوق کے قصے سنتے ہیں اور گھر چلے جاتے ہیں۔ نہ کوئی سنجیدہ بات سننے آتے ہیں، نہ کچھ گرہ میں لے کر جاتے ہیں۔ یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آتی، ہماری شاعری کا ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں سے کوئی دور کا واسطہ بھی ہے۔ جو کچھ بھی ہے، ابھی تک حسن و عشق کا نعرہ ہے۔ میں نے اس بدعت سے بچنے کی کوشش کی ہے، اور اظہار کو اکثر جگہ نارومانی اور کھردرا رکھا ہے۔

اختر الایمان

(اقتباس ماخوذ: پیش لفظ بنتِ لمحات)